ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 6 No.1 2022

عصری حسّیت اور وجودی دانشوری: پل بھر کا بہشت از سرمد صہبائی

Contemporary Sensitivity and Existential Intellectualism: The Paradise of the Moment by Sarmad Sehbai

*ڈاکٹر محمد نوید
**ڈاکٹر طاہر نواز
***راؤ محمد عمر

Abstract
Sarmad Sehbai is a well-known writer of modern era. He is a drama writer, critic and distinguished poet. The sixties and seventies are of great importance in the context of modern literature. From the point of view of modern poetry, the Urdu poetry that was brought by Rashid and especially Majeed Amjad, the poets of that period did not go beyond this point either technically or thematically. Reading Sarmad's poems, it is clear that he has secceeded in reaching the brain of modernity. From a technical point of view, his poetry is a continuation of the tradition of Rashid and Majeed Amjad and seems to carry this legacy in a positive direction. In this article, effort has been made to elaborate the legacy of Sarmad's Poetry.
***Keywords**: Sarmad Sehbai, Sarmad's Poetry, Modern Poet, Modern Poetry,*

عصرِ حاضر کے جدید شعرا میں سرمد صہبائی ہمعصر شعرا کی نسبت عصری حسّیت اور وجودی دانشوری کی بنا پر زیادہ اہم مقام کے حامل قرار پاتے ہیں۔ اُن کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک شعر و ادب کسی شاعر یا ادیب کا نجی معاملہ نہیں بلکہ ایک معاشرتی عمل ہے۔ شاعر و ادیب اپنے عصری مسائل و معاملات سے نگاہیں چُرا نہیں سکتا کہ یہ اُس کی اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ سرمد صہبائی نے بھی اپنی اخلاقی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا ہے۔ اُنھوں نے اپنے ڈراموں کی طرح اپنی شاعری میں بھی سماجی ناانصافیوں، عام انسان کی محرومیوں اور طبقاتی مسائل پر احتجاج کو اپنا فرضِ منصبی جانا ہے۔ اُن کی شاعری میں نہ صرف اپنے عہد کے سماجی و سیاسی مسائل کا شعور ملتا ہے بلکہ ایک وجودی دانشور و منصف کی مانند وہ اپنے عصر کے حالات کا جائزہ لیتے نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے عہد کی آلائشوں سے ملوث زیست میں سے مثبت اور سچی اقدار کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرمدؔ صہبائی شاعروں اور ادیبوں کی بھیڑ میں سب الگ نظر آتے ہیں ان کا اپنا ایک مزاج ہے اور کلام کا اپنا انداز ہے وہ اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی ستائش کے لیے کسی کے در پر جاتے ہیں۔ سرمد کہتے ہیں۔

ہر کوئی شامل ہوا سرمدؔ جلوسِ عام میں　　مُنہ اٹھائے چل دیا ہے تو کدھر سب سے الگ　　(۱)

میڈیا کے اس دور میں جب ہر کوئی شہرت کے پیچھے بھاگتا ہے، ہر شاعر ادیب شہرت حاصل کرنے کے لیے مختلف ہتھ کنڈے استعمال کرتا ہے نامور شاعروں اور ادیبوں سے کتابوں کے فلیپ لکھوائے جاتے ہیں، پیش لفظ اور دیباچے لکھوائے جاتے ہیں مگر سرمدؔ نے اپنی کتابوں پر کسی بھی نامور شاعر یا ادیب سے کچھ نہیں لکھوایا۔ **پل بھر کا بہشت** کے بیک ٹائٹل پر سرمد صہبائی نے اپنی شاعری کی پذیرائی اور ستائش کے لیے کسی نامور ادیب یا شاعر کے پاس اپنی کتاب کا مسودہ تجزیے کی غرض سے نہیں بھیجا یہ ان کی ایک انفرادیت ہے جو انھیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ سرمد خود بھی کہتے ہیں۔

ہے رہ و رسمِ زمانہ پردہ بیگانگی　　درمیاں رہتا ہوں میں سب کے مگر سب سے الگ　　(۲)

سرمدؔ کی کتابوں کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ان کا دیباچہ یا پیش لفظ کسی اور سے لکھوانا تو درکنار خود بھی ان کی کتابوں کے بارے میں خامہ فرسائی کرنے سے گریز کیا ہے۔

پل بھر کا بہشت ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کا انتساب سرمدؔ نے ۲۰ جنوری کے نام کیا ہے۔ ۲۰ جنوری ان کی والدہ کی سالگرہ کا دن ہے۔ اور اس کے نیچے مادھو لال حسین کا یہ مصرعہ لکھا ہے:

---

* صدرِ شعبہ اردو، قراقرم انٹر نیشنل یونیورسٹی، گلگت بلتستان
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، قراقرم انٹر نیشنل یونیورسٹی، گلگت بلتستان
*** ویزٹینگ فیکلٹی، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 6 No.1 2022

۲۰ جنوری کے نام

"مائے نے میں ہوئی دیوانی

دیکھ جگت میں شور" (مادھو لال حسین)

انتساب سے اگلے صفحہ پر سرمدؔ نے ایک اقتباس دیا ہے جو حسب ذیل ہے:

"خبر تحیر عشق سنئے کہ نہ جنوں رہا نہ پری رہی نہ قدیم نہ جدید نہ تو نہ میں نہ سرکار نہ دربار نہ نظر نہ نظریہ جو رہی سو بے خبری رہی خلقت رات دن کی رحل پر رکھی کتاب عقل کی قرات میں گم ہے شورِ کثرت میں نوائے سروش سنائی نہیں دیتی۔ سو بے خبری کی واٹ میں چلنے والے نیند اور بیدار کیے درمیان دشتِ ہلاکت کی آوارگی میں رہتے ہیں کہ یہیں کہیں کسی سخن زاد سے وصال ممکن ہے" سرمد صہبائی (ڈائیلاگ اون آرٹ سے اقتباس) (۳)

یہ ابتدائی صفحات ہیں جو ترتیب سے پہلے ہیں ان پر صفحہ نمبر درج نہیں ہے۔ ترتیب سے پہلے ایک صفحہ پر یہ چند سطور درج ہیں۔

اڑتی رہیں سدا چڑیاں
ساون کی یہ پھلجڑیاں
جیسے سدا کنکی بالی
رمزوں بھری ہری ڈالی
بیتیں کبھی نہ یہ گھڑیاں
اُڑتی رہیں سدا چڑیاں

پل بھر کا بہشت کتاب کا نام اس کتاب میں شامل ایک نظم کا عنوان بھی ہے۔ جس میں سرمدؔ دکھوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے انسان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جو پل بھر کے لیے اپنے تمام دکھوں کو بھول جاتا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے دنیا اور اس کے لوازمات سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس لمحے میں وہ بے خود و سرشار ہوتا ہے اور یہی لمحہ اس کے لیے "پل بھر کا بہشت" ہے جس میں وہ اپنی تکلیفوں کو بھول کر مسکراتا ہے اور اس لمحے اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے دوسرے ہی لمحے انسان پھر پریشانیوں کے چنگل میں ہوتا ہے وہ ایک لمحہ اس کے لیے جنت ہے۔

ایک وہ پل جو شہر کی خفیہ مٹھی میں
جگنو بن کر
دھڑک رہا ہے
اس کی خاطر
ہم عمروں کی نیندیں کاٹتے ہیں
یہ وہ پل ہے
جس کو چھو کر
تم دنیا کی سب سے دلکش
لذت سے لبریز ایک عورت بن جاتی ہو
اور میں ایک بہادر مرد
ہم دونوں آدم وحوا
پل بھر کی بہشت میں رہتے ہیں
اور پھر تم وہی ڈری ڈری سی
بسوں پر چڑھنے والی، عام سی عورت

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 6 No.1 2022

اور میں دھکے کھاتا بوجھ اٹھتا
عام سا مرد
دونوں شہر کے
چیختے دھاڑتے رستوں پر
پل بھر رک کر
پھر اس پل کا خواب بناتے رہتے ہیں"

سرمدؔ صہبائی کی شاعری شہروں، انسانوں سے دور کہیں ماورائی دنیا میں نہیں لے جاتی بلکہ اسی شہری نظام زیست کے مسائل و معاملات کا احاطہ کرتی ہے۔ سرمدؔ کے ہاں عام آدمی اور اس کی خواہشات کا تذکرہ ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم "ملاقات" دیکھیں کہ اس نظم میں قاری کو اپنا کلچر بھی دکھائی دیتا ہے، جدائی تڑپ اور وصال کی طلب کس قدر شدید ہے۔

دروازے پر کون کھڑا ہے
عمروں کی تنہائی میں لپٹی عورت نے
پل بھر سوچا
کون ہے شاید وہ آیا ہے
اک لمحے کو اس نے اپنی دہلیزوں پر
دریا، بادل اور ہوا کو رکتے دیکھا
خواہش کی عمریاں بیلوں کو
اپنے دل کی محرابوں پر جھکتے دکھا
اس کے جسم کے اندر جاگے
سرخ پرندے
کمرے میں یکدم جیسے سورج در آیا
کیا یہ تم ہو کیا یہ تم ہو
پیاسے ہونٹ پہ اس کے نام کا رس بھر آیا"

سرمدؔ کی شاعری میں ایسے احساسات و جذبات کا بیان ہے کہ گویا وہ شہروں میں داخل ہوتے ہیں اور پھر انسانوں کے اندر جھانکتے ہیں وہاں سے وہ جذبات و احساسات اور ہجر وصال کے نغموں کو الفاظ کی صورت میں قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ سرمدؔ کی نظموں کے اگر موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو تمام مانوس موضوعات ہیں۔ مگر سرمدؔ کا انداز نیا اور اچھوتا ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے انسانیت کو اور اپنے سماج کو کتنے قریب سے دیکھا ہے۔ مثلاً ان کی نظمیں ہیں۔ "ملاقات"، "وہ پھول کاڑھتی رہی"، "وہ گھر بسانے کی خواہش"، "پیپنی"، "یہیں کہیں انہی بازاروں میں"، "اسے کون جینا سکھائے گا"، "تباہ شدہ شہر میں آخری دن"، "عام انسان کی محبت"، "شہر کے وسط میں بت"، "آفت زدہ لوگوں کی نظم"، وغیرہ ان کے علاوہ اور بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں انسان چلتے پھرتے اپنے روز مرہ معمولاتِ زندگی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ سرمدؔ کے ہاں شہروں میں بے حسی کی کیفیت اور انسان کی شناخت کا ختم ہو جانا انسان کا انسانوں سے لاتعلق ہونے کا المیہ بھرپور انداز میں ملتا ہے، جو کہ جدید شہری و صنعتی دور کی پیداوار ہے۔

؎ بند گلیوں میں گلیاں ہیں گھروں سے گھر جدا
ہے کوئی اس شہر میں شہر دگر سب سے الگ

؎ یہ کیسا شہر ہے مجھ سے گریزاں ہے مرا سایہ
ہجوم ناشناساں میں رخ محرم بدلتا ہے

ے شہر والے اپنے سائیوں میں سمٹ کر سو گئے
چاند شب بھر ساتھ میرے دربدر ہوتا رہا

سرمدؔ کی شاعری گہرے سماجی شعور سے مزین ہے۔ سرمدؔ معاشرے میں ہونے والے ظلم وناانصاف کا بڑی چابکدستی سے پردہ چاک کرتے ہیں کہ کس طرح مظلوم اور بے کس لوگوں کے نام پر مال و دولت اکٹھی کی جاتی ہے مگر جن بے سہارا لوگوں کو سہارا دینے کے لیے دولت اکٹھی کی جاتی ہے وہ بے سہارا ہی رہتے ہیں اس دولت سے بااثر لوگ اپنے سہاروں کو مزید مضبوط بناتے ہیں ۔اس حوالے سے ''آفت زدہ لوگوں کے لیے نظم'' بہت اہمیت کی حامل ہے اس نظم میں سرمدؔ مصیبتوں اور دکھوں کے مارے لوگوں پر یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ تمھارے نام پر جمع کیے گئے چندے سے تمھارا پیٹ نہیں بھرے گا تمھارے بدن کو ڈھانپنے کے لیے کپڑا نہیں ملے گا، سر چھپانے کو چھت نہیں ہو گی بلکہ اس سے بااثر افراد کا بنک بیلنس بڑھے گا۔ زیادہ دولت اکھٹی کرنے کے لیے آفت زدہ لوگوں کے دکھوں کی تشہیر کی جاتی ہے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ نظم کے چند ٹکڑے ملاحظہ کیجیے:

ے وہ تیرے باپ کے مسخ چہرے کی تصویر
اخبار میں چھاپ دیں گے
تیری بیٹیوں کی پھٹی اوڑھنی کو گلے سے لگا کر
تیرے جیسے مرنے کے صدموں کو
اک لوک قصہ سمجھ کر سنیں گے
بہت سر دھنیں گے
مگر دکھ ترا کون بانٹے گا
تیرے لیے کون رستوں پہ نکلے گا

اس نظم میں شاعر بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ زلزلہ زدگان کے لیے، سلاب زدگان کے لیے مہاجرین کے لیے خیراتی شو منعقد کیے جائیں گے نمائشیں لگیں گی دوسرے ملکوں سے ان کے نام پر چندہ اکٹھا کیا جائے گا مگر جن لوگوں کے لیے چندہ دیتے ہیں وہ مصیبت زدہ لوگ اسی کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کے نام پر اکٹھے کیے گئے چندے میں سے ایک پائی بھی انھیں نہیں دی جاتی:

ے تیرے لیے حکمراں
ملک در ملک چندہ اکٹھا کریں گے
تری لاش کے اشتہاروں کی قومی نمائش پہ
ٹکٹیں بکیں گی
خدا خوف شہری دعاؤں کے تحفے خریدیں گے
زرپوش نعروں سے تیری
سرِعام تجہیز و تکفین ہو گی
بتا کون رستوں پہ نکلے گا
تیرے لیے کون رستوں پہ نکلے گا

سرمدؔ یہ سب باتیں اپنے انداز اور اپنے رنگ میں کہتے ہیں اور اس پر واعظانہ رنگ کبھی غالب نہیں ہوتا ایسا لگتا ہے کہ سرمدؔ پورے معاشرے کا عمیق نظری سے مشاہدہ کرکے اس کا عکس دکھا رہے ہیں۔اس سلسلے میں خالد احمد کی رائے بہت اہمیت کی حامل ہے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 6 No.1 2022

"سرمدؔ کا کلام پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ منبر پر کھڑا وعظ کر رہا ہو ہے یا کوئی پیغام دے رہا ہے یا ہمارے معاشرے کو آئینہ دکھا رہا ہے۔اس کی نظمیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مخاطب کر رہا ہے اس کی ذات پورے معاشرے کا وجود ہے اس کے زخم ہمارے تمہارے زخم ہیں اس کی بحالی ہم سب کی بحالی ہے وہ اپنے آپ کو بدل دینا چاہتا ہے یعنی ہم سب کو بدل دینا چاہتا ہے" (۴)

سرمدؔ کی نظموں میں پورے معاشرے کا کرب سمٹ کر آجاتا ہے اور وہ اس کو اتنی فنکاری سے استعمال کرتے ہیں کہ احساس تک نہیں ہوتا کہ سرمدؔ معاشرے کی نمائندگی کر رہے ہیں:

ے بولی کیسے جنے گی
کہ سورج اجلے کنول پر
گہن کی سیاہی ہے
اور باپ لمبے سفر پر ہے
صحرا میں کالے پانی
اسے عمر کی قید

سرمدؔ کی شاعری میں معاملہ بندی کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں بعض اوقات تو معاملہ بندی سے بھی بات نکلتی ہوئی کسی چوتھی سمت میں چلی جاتی ہے۔اور کہیں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور سرمدؔ وصال کی ساری باتیں ایک خاص فنکارانہ انداز سے کر جاتے ہیں۔

"پیپنی" نظم میں سرمد محبوب سے ملاقات کا پورا منظر بیان کرتے ہیں اور وصال کے لمحے کو قید کر لیتے ہیں:

ے آہستہ سے
اس کے ہاتھ سے پیپنی لے کر
میں نے اپنے ہونٹ کو جیسے
اس کے دو ہونٹوں پر رکھا
جیسے میں نے
اس کا گیلا تالو چکھا
چشموں، ندیوں ڈھلوانوں میں
دروازوں، روشن دانوں میں
پیپنی گونجی
پیپنی گونجی دور تک
عمروں کی شاخوں پر چڑھے بور تک

سرمدؔ کی نظموں میں محاکات نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔وہ اپنے محبوب کی ایسی تصویر گری کرتے ہیں کہ محبوب کا پورا سراپا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔وہ محبوب کے جسم کے خدوخال اس فنکارانہ مہارت اور جزئیات نگاری سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے جمالیاتی ذوق کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ان کی نظمیں مرقع نگاری کا بھی اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں:

ے گردن میں پھولوں کے مفلر
کانوں میں بل کھاتی مندری
جھومتے تنگ منگے دن

سرمدؔ اپنی نظموں میں خیالات کے گھوڑے نہیں دوڑاتے نہ شہر میں رہتے ہوئے لوگوں کے درمیان بستے ہوئے ماورائی یا غیر مرئی مخلوق کی بات کرتے ہیں بلکہ شہر میں رہتے ہوئے شہر اور شہر والوں کی بات کرتے ہیں۔ ان کا انداز تمثیلی ہے وہ اپنی تمثال نگاری سے تمام واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ان کی کچھ نظموں کے عنوان دیکھیں جو شہر والوں کی غمازی کرتے ہیں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

Vol 6 No.1 2022

۔"ملاقات"، "اندرون شہر کی ایک لڑکی کے نام"، "پیپنی"، "وہ بین کرتی ہے"، "تباہ شدہ شہر میں آخری دن"، "کرفیو"، "عام انسان کی محبت"، "شہر کے وسط میں بت"، "شادی کی سالگرہ پر نظم" اور "سازش کے شہر میں گمشدہ لڑکی" وغیرہ نظمیں ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو نظموں کے عنوانات میں باقاعدہ شہروں کا حوالہ موجود ہے۔ اور ان کی نظموں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں ہمارے معاشرے کے تمام شہری مسائل اور حالات کا بھرپور تذکرہ ملتا ہے۔ "شہر کے وسط میں بت" سرمدؔ کی ایک تمثیلی نظم ہے اس نظم میں سرمدؔ بڑی چابکدستی سے اصل حقائق کو تمثیلی انداز میں بیان کرتے ہیں:

۔ مرے سامنے
لوگ ہر روز شہروں میں پھیلے ہوئے زائچوں کی بجھارت میں
تقسیم ہوتے ہیں
جینے کی خواہش میں اپنا بدن کاٹ کر
شام کو
بیویوں کے لیے
جھوٹے خوابوں کے تحفے لیے
اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹتے ہیں
مری آنکھ بے نم مرا جسم پتھر

اس نظم کا تعلق آسکر وائلڈ کی کہانی ہیپی پرنس(Happy Prince) سے ہے۔ اس میں ہیپی پرنس کی طرح شہر کے وسط میں بلند ترین جگہ پر تابوت میں قید ایک بت کھڑا ہے جو شہر میں ہونے والے ظلم واستحصال کو دیکھ رہا ہے۔ مگر وہ بے حس وحرکت سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس تمثیلی نظم میں بڑے بھرپور انداز سے بے حسی کو اجاگر کیا گیا ہے۔

۔ مرے سامنے
لوگ چاروں طرف
شہر در شہر، گلیوں مکانوں سے
اجڑی ہوئی بستیوں سے نکل کر
مری سمت بڑھتے ہیں
میں خاک کے سرد تابوت میں قید
صدیوں سے گونگی بلندی پہ آ کھڑا ہوں
مری آنکھ بے نم
مرا جسم پتھر

سرمدؔ کی شاعری میں عام انسانوں کی نمائندگی ملتی ہے مگر وہ یہاں پر عام اور خاص لوگوں کا تقابل بھی پیش کرتے ہیں۔ "عام انسان کی محبت" میں وہ عام انسان کی مصروفیات اس کا لوگوں سے ملنا جلنا اور عام مجمعوں میں جانا اور لوگوں سے مل کر خوش ہونا دکھاتے ہیں۔

۔ میں عام انسان
بک سٹالوں پہ ہوٹلوں، پارکوں میں اکثر
دکھائی دیتا ہوں اور تم کو
یہ عام انسان
تمام شہروں کے ہر چوراہے پہ آ ملے گا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 6 No.1 2022

کہ تو مجھے ہر جگہ ملی ہے

ہمارا ملنا کوئی مقدر نہ معجزہ ہے

یوں تو سرمدؔ کی ساری شاعری میں ایک عام آدمی متوسط طبقے کی زندگی ملتی ہے مگر اس حوالے سے یہ نظم " زندگی کیسا خطہ ہے " خاص طور پر قابل ذکر ہے اس نظم میں ایک عام آدمی کی پوری زندگی نظر آتی ہے اس کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں وہ کن کن مشکلات سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ نظم میں انہوں نے ایک متوسط طبقے کے انسان کی پوری زندگی لا کر ہمارے سامنے رکھ دی ہے کہ کس طرح یہ زندگی سے لڑتے لڑتے ایک دن زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ اس سے جہاں ایک عام آدمی کے شب و روز ملتے ہیں بلکہ شاعر کے وسیع مشاہدے کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح زندگی کو قریب سے دیکھا اور اس سے کیا اخذ کیا ہے۔

ے رات دن کے مسلسل سفر میں

پگھلتے بدن کے معانی

مہینے کی تنخواہ، بیوی کی ہم بستری

اور بچوں کے سانسوں کی مہلت ہے

تعلیم

روزی کمانے کا دھندا ہے

کس کے لیے کون نروان کا بوجھ سہتا ہے

کلمہ پڑھو

آخرت، عاقبت

پنشن اور سرہانے پہ گمنام کتبہ

کہو زندگی کیسا خطہ ہے

کیا موت جسموں میں بانٹی ہوئی سانس کی آخری قسط ہے

زندگی میں انسان کے دل میں بے شمار خواہشات ، آرزوئیں جنم لیتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یعنی جوں جوں عمر گزرتی جاتی ہے خواہشوں میں تبدیلی واقع ہوتی جاتی ہے اور یہ خواہشوں میں دب کر مر جاتا ہے اور اس کی تمام خواہشیں بھی اس کے ساتھ دم توڑ دیتی ہیں۔ سرمدؔ زندگی کے اس سفر کو بڑے خوبصورت انداز سے ایک نظم " عجیب خواہشیں ہیں " میں سمو دیتے ہیں۔ انسان مسلسل ارتقائی مراحل سے گزرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی آرزوؤں اور خواہشات میں ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ یہ خواہشات پوری نہیں ہوتیں اس لیے ہر لحہ بدلتی رہتی ہیں۔

ے عجیب خواہشیں ہیں

کبھی چاند کو جیب میں ڈال کر

تیرہ گلیوں میں پھرنے کی خواہش

کبھی تیز بارش کے جھونکے میں

تیرے بدن سے لپٹنے کی خواہش

کبھی چلتے چلتے، اچانک

بچھڑنے کی خواہش

کبھی رات بھر جاگنے کی تمنا

کبھی دیر تک صبح سونے کی خواہش

نہاتی ہوئی لڑکیوں کو
کبھی چھپ کے تکنے کی خواہش
بڑھاپے میں کالج پڑھنے کی خواہش
کبھی سر پر دھن ساراجگ تیاگنے کی
عجیب خواہش ہیں
میں ایک دن انہی خواہشوں کے سر پر اسرار سایوں سے ڈر جائوں گا
دیکھنا ایک دن یونہی مر جائوں گا

سرمدؔ کی جمالیاتی حس بہت تیز ہے۔ وہ جمال کو بیان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ ہجر و فراق کے شاعر نہیں ہیں محبوب کے فراق میں آنسو نہیں بہاتے بلکہ اپنے محبوب کو خیالوں میں بھی دیکھ کر اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے قائل ہیں۔ سرمد وصال اور جمال کے شاعر ہیں۔

؎ اس کو بوسہ دے کر چاند چلا جاتا ہے
تنہا دھوپ میں رات کی رانی رہ جاتی ہے

سرمدؔ اپنے محبوب سے جو کبھی بچھڑتے بھی ہیں تو اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے خوبصورت چہروں کو دیکھتے ہیں مگر انہیں کوئی محبوب جیسا دکھائی نہیں دیتا۔ انہیں حسن و خوبی تو نظر آتی ہے۔ جس پر انہیں اپنے محبوب کا شبہ ہوتا ہے مگر وہ ان کا محبوب نہیں ہوتا کیونکہ اس میں محبوب جیسی خوبیاں نہیں ملتی۔

؎ میں نے دیکھا
یہیں کہیں ترا ہاتھ تھا لیکن
تیرے جیسے ہونٹ نہیں تھے، ہونٹ تھے لیکن
تیرے جیسا جسم نہیں تھا

سرمدؔ کا اپنا ڈکشن ہے انھوں نے یہ لفاظی کسی سے نہیں چرائی اور نہ ہی یہ سرقہ کے نتیجے میں ان کی شاعری میں موجود ہے۔ ان کے ہاں فارسی تراکیب کی نسبت اپنی علاقائی زبانوں کے الفاظ کا کثرت سے استعمال ملتا ہے جس میں مقامی رس بھرا ہوا ہے۔

ان کی شاعری میں لڑکیوں کا ذکر بھی دوسرے شعرا سے زیادہ ملتا ہے۔ لڑکیوں کے مسائل کو انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ ان کا مشاہدہ زبردست اور نفسیاتی حوالے بڑی گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی شاعری میں لڑکیوں کے ذہنی مسائل کو اتنی عمدگی سے بیان کیا ہے شاید ہی کسی خاتون شاعرہ نے پیش کیا ہو۔ ان کی بہت سی نظمیں لڑکیوں کے نام لکھی ہوئی ہیں۔

''پل بھر کا بہشت''میں مثالیں کثرت سے مل جاتی ہیں، مثلاً''اندرون شہر کی لڑکی کے نام''، ''ایک سیدھی سی لڑکی کے نام''، ''نیشنل کالج آف آرٹس کی ایک تجریدی لڑکی کے نام'' اور ''سازش کے شہر میں گمشدہ لڑکی کے نام'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو انھوں نے براہ راست لڑکیوں کے نام لکھی ہیں۔

''ایک سیدھی سی لڑکی کے لیے نظم''میں شاعر نے ایک عام لڑکی کے لیے لکھا ہے کہ وہ شہر کی مکاریوں اور چالاکیوں سے واقف نہیں ہے لیکن وہ خود کو اس رنگ میں رنگنے کی خواہش مند ہے۔ شاعر اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

؎ تو ایک سیدھی سی لڑکی
تو کیوں اپنے آپ کو الٹا پہن کے پھرتی رہی ہے

اس کے باوجود وہ اپنے خوابوں کا پیچھا کرتی ہے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتی ہے اور جب اس کی خواہش ایک لمحہ کے لیے اس کے ہونٹوں پر آتی ہے تو ایک ان دیکھا خوف اس کی آنکھوں میں در آتا ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے اپنی خواہشات کے اظہار سے حظ اٹھاتی ہے پھر پچھتاتی رہتی ہے اس کا ضمیر اُسے ملامت کر تا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک سیدھی سادی لڑکی ہے اس کا کام اپنی خواہشات کا اظہار نہیں بلکہ خواہشات پر چپ سادھ لینا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

Vol 6 No.1 2022

"سازش کے شہر میں گمشدہ لڑکی" میں سرمدؔ نے اس شاعر کا تذکرہ کیا ہے جس سے زندگی روٹھ چکی ہے جہاں زندگی، امن، سکون اور محبت کا نام تک نہیں ہے۔ اس اندھیرے سے بھرے شہر میں زندگی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کسی کو خواب دیکھنے کی اجازت نہیں ہے اور جو کوئی اس ظلم و ناانصافی کے خلاف بغاوت کرے اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ اس نظم میں یہ ایک ایسی ہی لڑکی ہے۔ یہ گمشدہ لڑکی جو زندگی کی تلاش میں ہے خواب دیکھتی ہے اور خواب میں وہ خوبصورت زندگی کی تمنا رکھتی ہے۔

ے
زندگی! زندگی!
شام کو کھول کر میرے کمرے کی کھڑکی پہ منڈلا رہی ہے
اندھیرے میں چاروں طرف
سرسراتی صدائوں کی دہشت
"آئو تمہارے لیے بچھوئوں اور خونخوار سانپوں کو ہم پالتے ہیں
تمہارے لیے موت آسان قسطوں میں کر دیتے ہیں"
مرے سرکتے ہوئے سائے میں
واہمے پھڑ پھڑانے لگے
زندگی! زندگی!
کس طرف ہے تیرا راستہ

ان نظموں کے علاوہ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں مثلاً! "پورٹرٹ" یہ نظم سرمدؔ نے کوئین میری سکول کے باہر ایک فقیر عورت کے نام کی ہے جو اپنے ہاتھوں میں خیالی بچہ لیے پھرتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے تمثیلی انداز میں بچہ کو پیش کیا ہے۔ بچہ اس فقیر عورت کے خواب ہیں جنھیں وہ ہر وقت اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے اور اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی خواہش مند ہے لیکن شہر والے اس کے خوابوں کو توڑ رہے ہیں۔

ے
میں نے اکثر سوچا ہے
تیرا بچہ کبھی ہمارے شہروں میں بھی پیدا ہو گا
لیکن ہم نے تیرے اس بچے کو شاید
مار دیا ہے
شاید تو اس کے قاتل کو
ہم سے ڈھونڈھتی رہتی ہے

۸۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے نے ہر شخص کو ہلا کر رکھ دیا۔ تاریخ کے اس بدترین زلزلے میں شہروں کے شہر تباہ و برباد ہو گئے۔ بہت سے دیہات صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ اس زلزلے میں بہت زیادہ سکول بھی زمین دوز ہو گئے تھے جن میں سینکڑوں بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جس وقت زلزلہ آیا تھا اس وقت سب بچے سکولوں میں تھے اور وہیں سکول کی چھتوں تلے ڈھیر ہو گئے۔ سرمدؔ بھی اس حادثے سے متاثر ہوئے اور انھوں نے نظم "گنتی" انھی بچوں کے لیے لکھی۔ اس نظم میں سرمد ان بچوں کے روزانہ معمول کی بات کرتے ہیں کہ بچے کس طرح روزانہ سکول جاتے ہیں تختیاں دھوتے اور گنتی لکھتے ہیں اور روزانہ گنتی یاد کرتے ہیں ایک دو تین چار لیکن جب زلزلہ آتا ہے اور سکول تباہ ہو جاتے ہیں تو ان مرنے والے بچوں کی لوگ آکر "گنتی" کر رہے ہیں۔

ے
اب پ ت
ہم چھوٹے تھے
امی مارتی تھی
ہم روتے تھے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 6 No.1 2022

اب پ ت
ہم سکول جاتے تھے
رستے میں پہاڑ تھے
ایک دریا بہتا تھا
ہم اپنی تختیاں
مل کے خوب دھوتے تھے
ایک دو تین چار
ہم گنتی کرتے تھے
ایک دن ہم مر گئے
پڑھتے پڑھتے ڈر گئے
وادیاں خاموش ہیں
اور کوئی گنتا ہے
ایک دو تین چار

پل بھر کا بہشت میں سولہ غزلیں بھی شامل ہیں۔ غزل کی روایت بڑی مضبوط ہے اس میں نام پیدا کرنا مشکل ہے اور یہ اردو شاعری کی آبرو جو ٹھہری ہے اس لیے اس سے کنارہ کشی بھی ممکن نہیں اس لیے ہر شاعر نے غزل میں طبع آزمائی ضرور کی ہے۔ سرمدؔ نے اس روایت کو زندہ رکھا اور اچھی غزلیں کہی ہیں۔

غزل میں سرمدؔ صہبائی غالبؔ سے متاثر ہیں۔ ”پل بھر کا بہشت“ میں ایک غزل انھوں نے غالب کے انداز بیان میں کہی ہے اور اسے غالب ہی کی نذر کیا ہے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عرصہ خواب میں ہوں ہوش سے رخصت ہے مجھے   گردشِ شام و سحر ساغر الفت ہے مجھے
اس خم زلف سے کھیلتا ہے مقدر میرا   ظلمت سیہ مطلع قسمت ہے مجھے
بس کہ بیماری، جاں میں بھی میں آرام سے ہوں   آمدِ شام بلا عیدِ عیادت ہے مجھے
کیوں معاصر نہ ہوں وہ غالبؔ آشفتہ مرا   میں ہوں پوشیدہ ولی کفر سے نسبت ہے مجھے
جلسئہ رسم سخن عام ہے لیکن سرمدؔ   اس کی آواز کہیں لہجہ جدت ہے مجھے

سرمدؔ صہبائی اپنی شاعری میں نظموں کی نسبت اپنی غزلوں میں زیادہ ہجر و فراق کی کیفیت سے دوچار ہیں۔

عمر بھر سرمدؔ تھی جس کو یاد رکھنے کی سزا   سامنا اس شوخ سے ایک لمحہ بھر رکھا گیا

سرمدؔ صہبائی اس عمر کو ایک مسلسل ہجر کا نام دیتے ہیں کہ زندگی ہجر کی کیفیت میں آگے بڑھتی ہے۔ ہجر میں زندگی کے نئے در وا ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس عمر میں وصال ممکن نہیں ہے۔

یہ عمر تو اک مسلسل ہے مری جان   ہم جس میں ملے تھے وہ کوئی اور جنم تھا

ایک مقام آتا ہے کہ سرمدؔ ہجر وصال اور خوشی و غم کی کیفیت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور ان کے نزدیک ان سب کی کوئی حیثیت نہیں رہتی اور وہ ایک لذت و مستی سے سرشار ہو کر کہتے ہیں۔

اک لذت بے نام سے سرشار تھے   کھٹکا تھا خوشی کا نہ ہمیں خطرہ غم تھا

الغرض **پل بھر کا بہشت** صرف سرمدؔ کی شاعری کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی مکمل دستاویز ہے۔ **پل بھر کا بہشت** میں متنوع موضوعات ہیں اس میں وصال و فراق اور حسن و عشق کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب و ثقافت اور معاشرت بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس معاشرے میں رہنے والے عام آدمی کے مسائل نظر آتے ہیں۔ سرمدؔ اپنے معاشرے کے مسائل کو ایک ڈرامائی انداز میں اور تمثیلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے جہاں لڑکیوں پر نظمیں لکھیں وہاں اس معاشرے کے ستائے ہوئے لوگوں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو

خوب سے خوب تر بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کا منفرد لہجہ، ستھرا اسلوب اور ڈرامائی تاثر قاری کے دل پر اثر کرتا ہے۔ اس شاعری مجموعے میں انھوں نے ایسی نظموں یا غزلوں کو شامل نہیں کیا جو ان کے معیار پر پوری نہیں اتریں یا جن میں انھوں نے کوئی کمی محسوس کی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں اس کتاب کے مسودے کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"ابھی پچھلے سال جب وہ میرے پاس آیا تھا اور اپنی بعد کی نظمیں اور غزلیں لایا تھا کہ تم ان کو ایک نظر دیکھو کہ ان میں سے کون سے رکھی جا سکتی ہیں۔ تو میں نے کچھ چیزیں نکال بھی دیں۔ لیکن اس کا رویہ دیکھیں اس بارے میں اس نے کہا" میں تو تمہارے پاس لایا تھا کہ تم ایک ظالم نقاد کی طرح ان کو دیکھو گے اور بہت کچھ نکال دو گے لیکن تم نے تو بہت کم نکالی ہیں"۔ دیکھیں اگر دوسرا شاعر ہوتا تو اس بات پر زیادہ احتجاج کرتا کہ یہ بھی اچھی تھی تم نے کیوں نکال دی لیکن اس نے کہا" اور نکال دو اس میں سے"۔(۵)

پل بھر کا بہشت میں موضوعات کی فراوانی ہے اور اس میں سرمدؔ صہبائی نے جو ڈکشن استعمال کیا ہے وہ بھی نیا ہے اس میں بھی ہمیں اپنی تہذیب و معاشرت دکھائی دیتی ہے۔ ویسے بھی سرمدؔ روایتی ڈکشن سے بیزار ہیں کیونکہ اس میں اپنی چیز نہیں ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کہتے ہیں:

"اس کے ہاں مسلسل ایک سفر ایک تجسس ہے اس کے ہاں ورائٹی ہے۔ شاعری میں نظم میں دیکھو ڈرامائی لہجہ آ جاتا ہے"۔(۶)

سرمدؔ کیونکہ اچھے ڈرامہ نگار بھی ہیں اس لیے ڈرامائی تاثر یا لہجے کا آجانا ایک قدرتی امر ہے۔ الغرض ان کا یہ شعری مجموعہ بھی منفرد اور موضوعات کا تنوع لیے ہوئے ہے۔

سرمدؔ کے معاصرین میں بیشتر نے جدیدیت کے مغز تک پہنچے کی کوشش کی لیکن وہ اس لیے ناکام نظر آتے ہیں کہ انھوں نے علامتوں یا علامت نگاری کو جبراً پکڑ کر اپنی نظموں میں گھسیڑا جبکہ سرمدؔ کے ہاں علامتیں خود بخود چلی آتی ہیں اور نظم میں یوں مدغم ہو جاتی ہیں کہ نظم کا جمالیاتی حسن زائل نہیں ہوتا۔ سرمدؔ کی نظموں کی ایک اور خاصیت یہ بھی ہے کہ ایک کامل افسانے کی طرح ان میں کوئی غیر ضروری لفظ، غیر ضروری منظر نگاری اور تفصیل نہیں ہے۔ وہ اپنی نظموں میں قاری کے لیے بہت کچھ چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں۔

جہاں تک غزل کا سوال ہے تو مقالے میں دو ایک جگہ ان کی غزل کو" روایتی غزل" بھی کہا ہے اس سے مراد بھی یہی ہے کہ سرمدؔ کی غزل واقعی غزل ہے۔ سرمدؔ نے غزل کی تمام تر ضروریات کو مد نظر رکھا ہے اور غزل کو نظم نہیں بنا ڈالا یہ بھی ان کی فنی مہارت کا ایک ثبوت ہے، مگر سرمدؔ غزل و تغزل کا بھرپور خیال رکھنے کے باوجود یہ نہیں بھولے کہ وہ کس دور کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انھوں نے غزل میں بھی بڑی ذہانت سے عصری مسائل اور مشاہدات کو سمویا ہے اور یوں سمویا ہے کہ غزل غزل ہی رہی ہے۔ سرمدؔ کی تشبیہیں، استعارے اور علامتیں انجانی محسوس نہیں ہوتیں۔ بڑے شاعروں کی طرح سرمدؔ نے روایتی استعاروں اور علامتوں کو نئی معنویت بھی دی اور ساتھ ساتھ جدید علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کو تخلیق بھی کیا ہے۔

اردو کی ادبی تحریک میں ساٹھ اور ستر کی دہائی جدید ادب کے تناظر میں انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ جدید نظم کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو نظم کو جس نہج پر راشد اور بالخصوص مجید امجدؔ نے لا کھڑا کیا تھا اس کے بعد کے شعرا اس مقام سے نہ تو فنی حوالے سے آگے بڑھے نہ موضوعاتی اعتبار سے۔ اس زریں دور کے بعد شعرا میں محض چند ایک شعرا نے اس سیڑھی پر ایک درجہ اور بلند ہونے کی کوشش کی۔ سرمدؔ کی نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جدیدیت کے مغز تک پہنچنے میں کامیاب رہے ہیں۔ فنی اعتبار سے دیکھیں تو ان کی شاعری راشدؔ اور مجید امجدؔ کی روایت کا تسلسل ہے اور اس روایت کو مثبت سمت میں آگے لے جاتی دکھائی دیتی ہے۔ ڈکشن کے اعتبار سے بھی سرمدؔ نے پیش روئوں کی نسبت زبان کو زیادہ صاف اور مقامی بنایا ہے۔ راشد کے مفرس اسلوب، میراجیؔ کے مبہم اسلوب کو چھلنی میں ڈالا اور مقامیت رکھ لی باقی سب نکال باہر کیا۔ اس کے علاوہ دانشورانہ انداز میں اپنے عہد کے متوسط طبقے کے مسائل اور خواتین کے حقوق اور اُن پر جبر کے خلاف بھی غور و فکر کیا اور یوں ایک طرف تو اپنے فن کو مسلسل آگے بڑھایا اور دوسری جانب معاشی خوشحالی اور حقیقت اور صداقت کے فروغ کے لیے بھی علامتی انداز اپناتے ہوئے آواز بلند کی اور ایک حقیقی جدید علامتی شاعر ہونے کا حق ادا کیا۔

حوالہ جات

۱۔ آصف فرخی" فلیپ"، "نیلی کے سو رنگ" از سرمدؔ صہبائی، کراچی، کتب پرنٹر اینڈ پبلشرز لمیٹڈ، فروری ۱۹۸۶ء

۲۔ سرمدؔ صہبائی، "پل بھر کا بہشت"، اسلام آباد، الحمرا پبلیشنگ، ۲۰۰۸ء، ص:۱۴

۳۔ -------------ایضاً-------------------------ص:۱

۴۔ خالد احمد (انٹرویو) مشمولہ:: ہفت روزہ" امروز"، ۲۲۔ جولائی ۱۹۷۳ء، ص:۴

۵۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان (انٹرویو۔ مخزونہ رقم الحروف) بہ مقام: شعبہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۶ جون ۲۰۰۸ء

۶۔ -----------------ایضاً--------------------